Surah Nisa (Ayat 81-91)

Fi Zilaal Al Quran:

81: وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا ○

کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے ؟ تم ان کی پروانہ کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو ' اللہ ان کی یہ ساری سرگوشیاں لکھ رہا ہے ' مشورے کرتا ہے اگر یہ اللہ کی سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔

یہ گروہ ایسا تھا کہ جب یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس موجود ہوتا اور آپ سے قرآن سنتا اور قرآنی فرائض کو سمجھتا تو کہتا کہ ہم نہ کسی قسم ' بے قید اطاعت کا اقرار کرتے۔ اس میں نہ ہو کوئی اعتراض کرتے ' وہ اس طرح جامع اور مانع اطاعت کا اعلان کرتے ' مطیع فرمان ہیں ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر آپ کی باتوں ' لیکن جونہی وہ حضور کی مجلس سے اٹھتے ' نہ کوئی استثناء رکھتے ' کی توضیحات طلب کرتے کے خلاف مشورے کرنے لگ جاتا۔ اور یہ فیصلہ کرتا کہ حضور نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر عمل نہ کیا جائے اور کوئی ایسا منصوبہ اپنایا جائے کہ اس پر عمل نہ ہو اور گلو خلاصی ہو جائے۔

اس کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت من حیث الجماعت تو یہ کہتی ہے کہ ہم اطاعت کریں گے لیکن ان میں سے ایک گروہ رات کے وقت نکل کر وہ سازش کرتا ہے جو جماعت مسلمہ کے قول کے خلاف ہوتی ہے۔ اور اس گروہ منافقین کا مقصد اس جماعت کے اندر افراتفری اور بے چینی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں یہ گروہ منافقین سازش کر رہا ہوتا ہے۔ ان کی سرگرمیاں اسلامی صفوں کے اندر بے چینی پیدا کرتی ہیں جبکہ جماعت مسلمہ ان سازشوں کے خلاف ہر میدان میں معرکہ آرا ہوتی ہے اور اپنی پوری قوت ان کے مقابلے میں صرف کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اہل ایمان اور حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ اللہ کی نظروں سے یہ سازشی ٹولہ اوجھل نہیں ہے اور اس کی مکاری سے اللہ اچھی طرح باخبر ہے۔ یہ شعور اور احساس کہ ان سازشیوں کی سازشوں سے اللہ اچھی طرح خبردار ہے اہل ایمان کے دلوں کے اندر اطمینان اور قوت پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ ان کے اندر یہ سکون پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی نظر ہوتے ہوئے یہ سازشیں ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں۔ دوسری جانب سے ان سازشیوں کو بھی یہ سخت تنبیہ ہے کہ وہ ان سازشوں میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔

۔(اور اللہ ان کی یہ تمام سرگوشیاں لکھ رہا ہے) اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو منافقین "واللہ یکتب مایبیتون" (آیت) کے ساتھ معاملہ کرنے کا جو منصوبہ دیا تھا وہ یہ تھا کہ آپ ان کے ساتھ ان کی ظاہری حالت کے مطابق معاملہ کریں گے اور ان کے ساتھ ان کی نیتوں کے مطابق سلوک نہ ہوگا۔ ان کی خفیہ سازشوں سے اغماض برتا جائے گا اور اعراض کیا جائے گا۔ یہ ایک ایسا منصوبہ تھا جس کے مطابق آخر کار وہ منتشر ہوگئے کمزور ہوگئے اور ان میں سے جو باقی رہ گئے تھے وہ تتر بتر ہوگئے اور چھپ گئے۔ اس منصوبے کا ایک حصہ یہ تھا۔

(آپ ان کی پروانہ کریں) ان سے چشم پوشی کرنے کے ساتھ ساتھ رسول کو مطمئن کیا جاتا ہے کہ اللہ کی حفاظت "فاعرض عنھم" (آیت) اور پاسبانی پر مکمل بھروسہ رکھو۔

اللہ بھروسے کے لیے کافی ہے) بالکل درست اللہ بھروسے کے لیے کافی ہے ۔ (اور اللہ پر بھروسہ رکھو "وتوکل علی اللہ وکفی باللہ وکیلا" (آیت) 'نہ خفیہ سازش ان کے خلاف چل سکتی ہے۔ 'جس کا وکیل اللہ ہو اسے کوئی بھی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ نہ اسے کوئی سازش گزند پہنچا سکتی ہے ' اور نہ ظاہری سازش۔

سوال یہ ہے کہ یہ گروہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے اقرار اطاعت کرتا اور واپس ہوکر رات کو سازش کرنے میں لگ جاتا۔ وہ ایسا کیوں کرتا تو دراصل یہ گروہ یہ رویہ اس لیے اختیار کرتا تھا کہ اسے اس بات میں شبہ تھا کہ آیا حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو کلام پیش کرتے ہیں وہ اللہ کی جانب سے ہے یا نہیں۔ جب ایک لمحہ کے لیے اس قسم کا شک پیدا ہو جائے تو بات کی قوت اور شوکت ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن اور کلام رسول کی اندر قوت اور شوکت اسی شعور سے پیدا ہوتی ہے کہ یہ کلام باری تعالیٰ کی طرف سے آرہا ہے اگر عبداللہ کے حلقوم سے سنا جارہا ہے۔ اور یہ کہ آپ ہوائی باتیں نہیں کررہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو توکل علی اللہ کرنے کے بارے میں دوٹوک حکم دیا گیا اور مکرر تاکید مزید کی گئی۔

یہاں اللہ تعالیٰ ان کے سامنے ایک نکتہ پیش فرماتے ہیں۔ اور یہ نکتہ عزت وشرف کی وہ انتہا ہے جس تک قرآن کریم انسان کو پہنچانا چاہتا ہے کہ وہ اور یہ عقل وادراک اللہ ہی نے انسان کو عطا کیا 'عقل سے کام لے اور یہ سمجھ لے کہ وہ ایک ذی شرف مخلوق ہے۔ وہ صاحب عقل وادراک ہے ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کے بارے میں فیصلہ ان کے شعور اور ان کی عقل وادراک پر چھوڑتا ہے۔ اللہ ان کے لیے بصارت وبصیرت کا ایک منہاج متعین فرماتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ اس منہاج کے مطابق معاملات پر غور کریں تو وہ کبھی بھی ٹھوکر نہ کھائیں گے۔ یہ منہاج فہم وادراک قرآن میں نہایت ہی واضح طور پر متعین کیا گیا ہے۔ اور خود انسانی فہم وادراک بھی اس منہاج تک پہنچ سکتا ہے۔ اور اس طرح انسان اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ قرآن کریم اللہ کی جانب سے ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

82: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝

اس بیان اور ہدایت کے اندر انسانیت کے لیے انتہائی عز و شرف کا مقام پوشیدہ ہے۔ اس میں انسان کے ادراک پر مکمل بھروسہ کیا گیا ہے۔ اور اس کی شخصیت کو بہت ہی اہمیت دی گئی ہے۔ نیز اس میں عدالت عقل میں فیصلہ لے جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی ایک ایسے مظہر میں جس کا سمجھنا انسانی عقل کے لیے زیادہ دشوار نہیں ہے۔

جامع اور بے قید ہم آہنگی ایک ایسا مظہر ہے جو اس شخص کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا جو اس کتاب پر ' قرآن کے اندر پائی جانے والی مکمل تدبر کرے۔ اس مظہر کی سطح اور اس کا دائرہ مختلف لوگوں کی فہم کے مطابق وسیع اور تنگ ہو سکتا ہے۔ مختلف نسلوں اور مختلف قسم کے ذہین لوگوں کے نتائج فکر مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ہر عقل اور ہر نسل اور ہر دور کے لوگوں کو اپنی بساط کے مطابق اس سے کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے اور یہ کمی بیشی لوگوں کے فہم ان کی عقل اور ان کے علم و ثقافت کے اعتبار سے ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں مختلف لوگوں کا نتیجہ فکر ان کے تجربے صلاحیت اور تقوی کے مطابق محدود یا لامحدود ہو سکتا ہے۔

اور درست منہاج فکر و تدبر کے مطابق وہ اس مظہر کا ادراک کر سکتا 'ہر نسل اس کی مخاطب ہے ' یہ وجہ ہے کہ ہر شخص اس آیت کا مخاطب ہے ہے۔ یعنی یہ وصف کہ قرآن کے اندر خلاف بیانی نہیں ہے اور اس کے اندر مکمل ہم آہنگی اور تناسق پایا جاتا ہے۔ البتہ جس طرح ہم نے کہا یہ فہم جسے اس وقت کی موجودہ نسل کی صورت میں 'انسان کی صلاحیت اس کے علمی مقام تجربے اور تقوی کے حدود کے اندر رہتا ہے۔ یہ گروہ جس 'ایک ایسے کلام سے مخاطب کیا جا رہا تھا جسے وہ خوب سمجھتا تھا۔ اور اپنے فہم و ادراک کے ذریعے وہ اسے عمل میں لاتا تھا 'مخاطب کیا گیا تھا قدر اس کی طاقت کے حدود میں ہوتا تھا۔

یہ مظہر اور یہ صفت یعنی مکمل اتحاد فکر اور ہم آہنگی کی صفت کا اظہار سب سے پہلے قرآن کریم کے انداز تعبیر میں ہوتا ہے۔ قرآن کی طرز ادا اور بڑے سے بڑے ادب پاروں میں نشیب و فراز بھی 'فنی طریقہ اظہار مدعا کے اندر مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ انسانی کلام ہمارے سامنے ہیں ہم آہنگی بھی ہوتی ہے اور لغزش کلام بھی ہوتی ہے۔ ایک حصہ اگر پر زور ہوتا ہے تو دوسرے میں جھول ہوتی ہے۔ ایک میں اگر 'ہوتے ہیں ایک حصہ اگر رواں ہوتا ہے تو دوسرا نہایت ہی گنجلک ہوتا ہے۔ ایک اگر نہایت ہی 'فکری تخلیق ہے تو دوسرے حصہ میں پیش پا افتادہ ہوتا ہے روشن ہے تو دوسرا حصہ تاریک ہے غرض کلام کی فصاحت و بلاغت اور نقص کے سلسلے میں جو اوصاف ہوتے ہیں ان کے اعتبار سے انسانی کلام میں نشیب و فراز ہوتا ہے۔ نقائص کلام میں سے اہم نقص کلام کے اندر روانی اور ہم آہنگی کا فقدان ہوتا ہے جس میں بات جلدی جلدی ایک معیار سے کسی ایک ادیب کے اگر ادبی کردار 'گرتی ہے یا گرے ہوئے معیار سے اوپر کو اٹھتی ہے۔ ہر انسانی کلام کے اندر یہ مظہر قدم قدم پر سامنے آتا ہے

یا کسی ایک ہی ادیب کے فن پاروں کو لیں یا کسی ایک سیاست دان کی پالیسیوں کو لیں یا کسی ایک جرنیل کی جنگی ' یا اس کے افکار کو لیں ' کو لیں اس میں معیار کا یہ تفاوت قدم قدم پر نظر آئے گا۔ معیار تعبیر کے اندر زمین و آسمان کا فرق نظر ' یا کسی ایک شخص کی صنعت کاری کو لیں ' چالوں آئے گا۔

یعنی کلام میں پختگی اور ہم آہنگی۔ پورے قرآن کے اندر یہ صفت ' قرآن کریم کے اندر یہ صفت نہایت ہی واضح ہیں اور پوری طرح منعکس ہے ملحوظ رکھی گئی ہے۔ ہم یہاں جو بات کر رہے ہیں وہ صرف لفظی اور تعبیر کی ہم آہنگی کے زاویے سے ہے۔ اس پوری کتاب کے اندر کلام اور مضمون کے ' اسی وجہ سے یہ کتاب معجزانہ شان لیے ہوئے ہے۔ یہ کتاب جن موضوعات پر کلام کرتی ہے ' اسلوب اظہار کا ایک ہی معیار ہے اعتبار سے اس کے رنگ مختلف ضرور ہوتے ہیں لیکن فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اس کا معیار ایک ہی رہتا ہے۔ اسلوب ادا میں اس کا کمال قائم رہتا ہے۔ اور کسی جگہ کلام اپنی معیاری سطح سے گرنے نہیں پاتا۔ کسی جگہ اس کی حالت ایسی نہیں ہوتی جس طرح انسانی کلام کی حالت ہوتی ہے کہ کبھی معیار کچھ ہوتا ہے اور کبھی کچھ۔ یہ کتاب اللہ کی شان کاریگری لیے ہوئے ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بات کے کہنے والا متغیر نہیں ہے التصویر الفنی ' اور وہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف متغیر نہیں ہوتا۔ اور نہ اس پر ایک حال کے بعد دوسرا حال طاری ہوتا ہے۔ (دیکھئے فی القرآن)

اس کے فنی اسلوب کے بعد پھر یہ عدم اختلاف کی صفت اور مکمل ہم آہنگی اور عام وحدت فکر اس نظام کے اندر بھی پائی جاتی ہے جس کا اظہار و بیان قرآن کریم کی ان عبارات کے اندر کیا گیا ہے اور جس کا مفہوم ان ہم آہنگ عبارتوں کی اندر بیان ہوا ہے۔ یعنی وہ نظام فکر جس کی اوپر نفس انسانی کی تربیت کی گئی ہے یا انسانی معاشرے کی تربیت کی گئی ہے۔ نیز اس نظام زندگی کے تمام اجزاء اور اس کے تمام پہلوؤں کے اندر مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک فرد کی زندگی کی تمام سرگرمیوں اور پھر ایک معاشرے کے اندر فرد کی تمام سرگرمیوں اور نسلا بعد نسل ایک فرد اور معاشرے کی زندگی کے اندر جو تغیر و تبدل ہوتا ہے اس کے تمام پہلوؤں کے اندر مکمل توافق اور توازن پایا جاتا ہے۔ پھر انسان کی قوت مدرکہ کے جس کے کئی پہلو ہیں اور انسان کے فہم و ادراک کی کئی قوتیں اور عمل ادراک میں کام آنے والی مختلف قوتیں۔ ' لیے ایک منہاج اور تقویم ہے تمام نسلوں اور تمام سطحوں کے اندر بھی ایک مکمل ہم آہنگی رکھی گئی ہے۔ انسان اور ' پھر خود حضرت انسان کی ذات اور اس کے تمام معاشروں اس کائنات کے اندر بھی مکمل آہنگی ہے جس کے اندر یہ انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر انسان کی دنیاوی زندگی اور آخروی زندگی کے اندر بھی مکمل توافق اور ہم آہنگی ہے۔ پھر اس کتاب نے اس انسان اور اس پوری کائنات کے اندر اس کی زندگی بسر کرنے میں بھی پوری ہم آہنگی رکھی ہے۔

' جب ایک انسان اور اللہ کی کاریگری کے اندر باعتبار اسلوب کلام اور لفظی تعبیر فرق ہے تو فکری نظریاتی اور قانون سازی کی میدانوں میں بھی تمام انسانی مذاہب و مکاتب کے اوپر انسانی ' ظاہر ہے کہ انسانی کام اور ربانی کام کے اندر نہایت ہی واضح فرق و امتیاز ہوگا۔ تمام انسانی نظریات

چھاپ بالکل واضح نظر آتی ہے۔اور نقطہ نظر کے اندر جزئی اور انفرادی پن واضح طور پر نظر آتا ہے۔ان تمام پہلوؤں کے اندر وقتی حالات اور اس کے مذھب ومکتب کے اندر اور اس کے 'مشکلات سے انسان متاثر نظر آتا ہے۔اور انسان اس بات کا ادراک نہیں کر سکتا کہ اس کے نظریے منصوبوں کے اندر کوئی نہ کوئی تناقض موجود ہوتا ہے جو اس نظام فکر وعمل کے اندر کشمکش شروع کر دیتا ہے اور یہ کشمکش یا تو بہت جلد شروع ہو جاتی ہے یا کچھ عرصے کے بعد شروع ہوتی ہے۔پھر یہ انسانی مکاتب فکر وعمل انسان کی بعض خصوصیات کو بالکل دبا دیتے ہیں جبکہ خود انسان کو ان کا نہ علم ہوتا ہے اور نہ انسان انھیں پیش نظر رکھ سکتا ہے۔یہ پھر بعض شخصیات کے اندر ایسے اوصاف ہوتے ہیں جن کے بارے میں انسان سوچ ہی نہیں سکتا۔خود انسانی ادراک کے اندر ہزاروں کمزوریاں اپنی جگہ ہوتی ہیں اور جس کا دائرہ عمل نہایت ہی محدود ہوتا ہے۔چونکہ انسانی ادراک کا دائرہ محدود ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے بنائے ہوئے منصوبے سے آگے نہیں دیکھ سکتا بلکہ وہ خود اپنے موجود منصوبے کے (مالہ وماعلیہ) سے بھی اچھی طرح واقف نہیں ہوتا۔اس کے برعکس قرآنی منصوبہ چونکہ علیم وخبیر کا بنایا ہوا ہوتا ہے اس لیے قرآنی مندرجات ومفہومات ان تمام نقائص سے پاک ہوتے ہیں۔یہ مفہومات اور منصوبے مستقل ہوتے ہیں اور پوری کائنات کے اندر مروج نوامیس فطرت کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہوتے ہیں۔یہ نوامیس فطرت مستقل اور ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ مسلسل حرکت میں بھی ہوتے ہیں۔اسی طرح قرآنی نظریات بیک وقت متحرک بھی ہوتے ہیں۔اور ثابت بھی ہوتے ہیں۔

ان آفاق وحدود کے اندر قرآن کریم کی اس صفت پر غور وفکر سے بعض اوقات انسانی ادراک اس کے پورے آفاق کو نہیں پا سکتا اور نہ ہی بعض اوقات ایک پوری نسل اس کا مکمل ادراک کر سکتی ہے بلکہ تمام نسلوں کے ادراک میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا۔اس لیے کہ قرآن کریم سے ہر نسل اپنا حصہ پاتی ہے اور آنے والی ترقی یافتہ نسلوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ آفاق رہتے ہیں۔بہر حال اس صفت کے ادراک میں مختلف درجات کے اعلی انسانوں سے کچھ نہ کچھ ضرور باقی رہ جاتا ہے جس طرح دوسری چیزوں کے اندر کسی نہ کسی حد تک اختلاف موجود ہوتا ہے۔اور اس باقی آفاق سے اگلی نسلیں بھی اپنا حصہ حاصل کرتی رہتی ہیں اس لیے کہ اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں اور انسان کی بنائی ہوئی چیزوں میں فرق ہے۔اور اللہ کی بنائی ہوئی چیز میں نہ کوئی اختلاف ہوتا ہے اور نہ تفاوت اور فرق۔اس میں مکمل اتحاد اور تناسق ہوتا ہے۔ہاں لوگوں کی فہم وادراک کے حدود میں ضرور فرق ہوتا ہے اور بعض لوگ اس تناسق کو بہت ہی اچھی طرح سمجھتے ہیں اور بعض ذرا کم سمجھتے ہیں۔(تفصیلات کے لیے دیکھئے التصور الاسلامی خصائصہ ومقوماتہ۔نحو مجتمع اسلامی' الاسلام ومشکلات الحضارہ اور ھذا الدین وغیرہ)

اللہ تعالیٰ لوگوں کے فہم وادراک کے 'لیکن جس قدر ایک عام انسان سمجھ سکتا ہے یا ایک گروہ سمجھ سکتا ہے یا ایک متعین نسل سمجھ سکتی ہے قرآن کریم کو پیش کرتے ہیں اور ان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ سوچیں کہ یہ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اور 'جس قدر ان کو حاصل ہے 'سامنے اگر غیر اللہ کا کلام ہوتا تو لوگ اس میں بہت کچھ اختلافات پاتے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک مختصر سا توقف کریں اور یہ متعین کرلیں کہ اس مخصوص معاملے میں یا پورے دین کے معاملے میں انسانی ادراک کی حدود کار کیا ہیں؟ کوئی انسان اس بات سے غرے میں مبتلا نہ ہو جائے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ خود انسانی ادراک کے سامنے فیصلے کے لیے پیش کیا ہے اس لیے گویا انسانی ادراک کوئی بہت ہی بڑی شئی ہے۔ انسانی غور و فکر اور ادراک کو بھی اپنی محفوظ حدود کے اندر رہنا چاہیے کہیں وہ اپنے محدود محفوظ دائرے سے باہر بھول بھلیاں میں پھنس نہ جائے۔

قرآن کریم کی ان ہدایات کو اچھی طرح نہیں سمجھا گیا اور نہ ہی ان کی حدود کو اچھی طرح سمجھا گیا ہے۔ ازمنہ قدیمہ اور دور جدید دونوں میں ایسے اسلامی اہل فکر رہے ہیں جنہوں نے عقل و قیاس کو شریعت کے مساوی درجہ دیا ہے بلکہ یہ لوگ عقل و ادراک کو شریعت کا پاسبان بناتے ہیں۔۔ لیکن حقیقت ایسی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فہم و ادراک کا یہ آلہ بہر حال انسانی قوت مدرکہ ہے اگرچہ اپنی جگہ یہ نہایت ہی اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کے مسئلے کو بارگاہ عقل و تدبر میں پیش کیا ہے لیکن عقل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرے کہ یہ قرآن اور اس کے اندر وضع کردہ پورے کا پورا دین من جانب اللہ ہے۔ اس لیے کہ قرآن کے اندر ایسے اوصاف و مظاہر ہیں جنہیں عقل بشری بڑی سہولت سے سمجھ سکتی ہے۔ اور وہ مظاہر اور علامات اس بات کے ادراک کے لیے کافی ہیں کہ یہ دین من جانب اللہ ہے۔ جب یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ یہ دین من جانب اللہ ہے تو اس ادراک کا منطقی نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ اد دین کے اندر جو احکام ہیں انھیں انسان اس لیے کہ جب ہم نے یہ بات تسلیم کرلی کہ یہ دین اور قرآن من ،تسلیم کرے چاہے ان کی حکمت انسان کی سمجھ میں آ رہی ہو یا نہ آرہی ہو جانب اللہ ہے تو یہ بات از خود تسلیم ہو جاتی ہے کہ اس کے اندر حکمت موجود ہے پھر یہ بات اہم نہیں رہتی کہ حالات حاضرہ کے اندر لوگوں کی مصلحت اس دین سے پوری ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ جب دین اللہ کی طرف سے ہے تو گویا مصلحت اس کے اندر موجود اور متحقق ہے۔ انسانی عقل شریعت کے مساوی نہیں ہوتی چہ جائیکہ کہ وہ شریعت پر حاکم اور مقتدر ہو جائے۔ اس لیے کہ خود شریعت کی حکمتوں کا ادراک ہر عقل نہایت ہی محدود پیمانے پر کر پاتی ہے۔ اور یہ بات محال ہے کہ عقل شریعت کے تمام زاویوں اور تمام مصلحتوں کا احاطہ کر سکے۔ نہ ایک لحظہ میں نہ پوری انسانی تاریخ میں۔ جبکہ اللہ کی شریعت کی نظر ایک ایک لمحے کی مصلحتوں پر بھی ہوتی ہے اور زمان و مکان کے مصالح پر بھی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ شریعت کا کوئی ثابت شدہ حکم صرف انسانی عقل و قیاس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں عقل انسانی کا کام صرف یہ ہے کہ وہ نصوص شرعیہ کے ادراک اور ان نصوص کی دلالت اور مفہومات کے اخذ پر غور کرے۔ یہ اجازت عقل کو نہیں دی جاسکتی کہ وہ احکام کی مصلحتوں پر بھی کلام کرے۔ اس لیے کہ جب اللہ کی جانب سے کوئی آیت نازل ہوتی ہے تو اس میں لازماً کوئی مصلحت ہوتی ہے تب ہی تو وہ جدید مسائل ہوں۔ ایسے مسائل کے بارے میں جو طریقہ کار اختیار کیا آتی ہے۔ عقل کا کام تو ان مسائل میں ہوتا ہے جن میں کوئی نص نہ ہو جائے گا اس کے بارے میں ہم اس سے پہلے کہہ آئے ہیں کہ ایسے مسائل کو اللہ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف لوٹا دیا جائے گا

۔اور یہی وہ دائرہ کار ہے جو حقیقی اجتہاد کے لیے کھلا چھوڑا گیا ہے جبکہ نصوص قرآنی کا فہم وادراک بہر حال ہر وقت عقل ہی کے ذریعے ہوگا۔ جب کسی نص کا مفہوم سمجھ لیا جائے تو بس اب وہاں توقف ہی بہتر ہوتا ہے اور عقل کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ فیصلہ دے کہ آیا اس مفہوم میں مصلحت ہے یا نہیں ہے۔ عقل انسانی کا اصل دائرہ کار کائنات کے قوانین قدرت ہیں اور یہ نہایت ہی وسیع دائرہ کار ہے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم عقل انسانی کو اسی قدر مقام و منزلت دیں جو اسے اللہ نے دیا ہے اور جو اس کے لیے مناسب ہے اور اس دائرے کے اندر اسے رکھا جائے جو اللہ نے عقل کے لیے رکھا ہے۔ اس دائرے کے حدود سے تجاوز نہ کیا جائے تاکہ وہ بھول بھلیاں میں جاکر پھنس نہ جائے اور اسے کوئی رہبر کامل نہ ملے۔ اور اگر کوئی رہبر ملے بھی تو وہ ایسے راستوں پر پڑ جائے جن کا اسے خود علم نہ ہو۔ یہ صورت حال ایک ایسے انسان کے لیے زیادہ خطرناک ہے جو صراط مستقیم کا متلاشی ہو۔

83: وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ
مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ○

اب سیاق کلام ذرا آگے بڑھتا ہے اور ایک دوسرے گروہ کو لیا جاتا ہے جو اسلامی معاشرے میں پایا جاتا ہے۔

یہاں جس گروہ کے بارے میں کہا گیا ہے یہ بھی اسلامی کیمپ میں موجود ایک گروہ ہے لیکن یہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو ابھی تک اسلامی نظام کے راہ ورسم سے اچھی طرح واقف نہیں ہے۔ اور اس گروہ کو ابھی تک اس بات کی سمجھ نہ تھی کہ اسلامی کیمپ میں بے چینی پھیلنے کے نتائج کس قدر خطرناک اور کس قدر تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ افواہیں افواہیں ہوتی ہیں' واقعات نہیں ہوتے۔ حالات بعض اوقات ایسے سنجیدہ ہوتے ہیں کہ ایک سرسری بات کے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ کسی ایک شخص کے بارے میں' کسی گروہ یا جماعت کے بارے میں بعض ایسے نتائج رونما ہوتے ہیں کہ سرسری ریمارک پاس کرنے والا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر یہ واقعات ونتائج برآمد ہو جائیں تو پھر ان کا تدارک اور تلافی کسی صورت میں بھی نہیں کی جاسکتی اور یہ لوگ یہ باتیں اس لیے کرتے ہیں کہ اسلامی کیمپ کے افراد کے اندر پیدا ہونے والی اخوت اور بھائی چارے کا تصور ابھی تک ان کے ذہن میں واضح نہ تھا۔ یہ لوگ اس بات کو اہمیت نہ دیتے تھے کہ آخر کار ایسی غیر ذمہ دارانہ گفتگوؤں کے کیا نتائج نکلنے والے ہیں اور ایسی باتوں کی اشاعت سے نقصان کیا ہوتا ہے کہ جب یہ باتیں ایک منہ سے دوسرے منہ میں چلتی رہتی ہیں' چاہے یہ باتیں امن کے حالات سے متعلق ہوں یا بے چینی اور خوف کے حالات سے متعلق ہوں۔ دونوں حالات کے اندر بعض خبروں کا پھیل جانا نہایت ہی مہلک اور فساد انگیز ہوتا ہے۔ مثلاً ایک چوکنے' تیار اور محتاط کیمپ کے اندر دشمن کی سرگرمیوں کو کم کر کے دکھانا غفلت کا باعث ہو سکتا ہے اور اس میں

دشمن متحرک ہو سکتا ہے۔ایسے حالات میں امن کے بارے میں لوگوں کو مطمئن کر دینا لوگوں کو غافل اور سست بنا سکتا ہے اگرچہ متعلقہ ذمہ داران کی طرف سے بار بار احتیاط کی تنبیہ کی جاتی رہے۔اس لیے کہ اگر خطرہ سروں پر ہو تو ایک انسان کا دشمن کے مقابلے میں چوکنا ہو جانا' ایسی صورت حال سے بالکل مختلف ہوتا ہے کہ محض ذمہ داران کے احکام کی اساس پر احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں۔اس قسم کی سستی اور لاپرواہی بعض اوقات معاملے کا حتمی فیصلہ کر دیتی ہے۔اسی طرح اگر ایک کیمپ اپنی قوت پر مطمئن ہو اور اپنے اطمینان کی وجہ سے ثابت قدم ہو اس کے اندر خوف پھیلایا جائے' تو ایسے کیمپ میں خوفناک خبروں کی اشاعت سے بے چینی افراتفری پیدا ہوتی ہے اور لوگ ایسی حرکات کرتے ہیں جن کی ضرورت نہیں ہوتی اور جن کی وجہ سے لوگوں میں خواہ مخواہ خوف وہراس پیدا ہوتا ہے اور بعض اوقات ایسی چیزیں نہایت ہی برے نتائج پیدا کر دیتی ہیں۔

بہر حال یہ ایک ایسے کیمپ کی خصوصیت ہے جس کا نظم ونسق ابھی تک مکمل نہیں ہوا یا اس کیمپ کے افراد کے اندر اپنی قیادت کے ساتھ وفاداری ابھی تک مکمل نہیں ہوئی' یا یہ دونوں کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اسلامی معاشرے میں یہ دونون باتیں پائی جاتی تھیں اس لیے کہ اس ابتدائی دور میں اسلامی معاشرے میں ایمان کے اعتبار سے مختلف سطح کے لوگ موجود تھے۔ مختلف فہم وادراک کے حامل لوگ موجود تھے اور محبت ووفاداری میں بھی یہ لوگ مختلف سطحوں اور درجوں کے تھے۔ غرض اس قسم کی افراتفری اور بے چینی کو قرآن کریم اپنے خالص ربانی منہاج کے مطابق دور کر رہا تھا۔

(آیت) " ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم " (۴ : ۸۳) (اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کریں)

یعنی اگر یہ لوگ امن اور خوف کی خبریں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گوش گزار کرتے' اس دور میں جب حضور موجود تھے' یا اہل ایمان میں سے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے' جبکہ حضور موجود نہ تھے' تو ان خبروں کی حقیقت یہ لوگ معلوم کر لیتے کیونکہ یہ ایسی چیزوں کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان متضاد خبروں کے درمیان سے وہ حقیقت کو اخذ کر لیتے ہیں یا مختلف قسم کے حالات سے وہ بات سمجھ لیتے ہیں۔

ایک مسلم سپاہی کا فریضہ یہ ہے کہ اگر وہ کوئی ایسی خبر سنے تو وہ اسے اپنے افسر تک پہنچا دے بشرطیکہ وہ بھی صحیح افسر ہو' وہ اس خبر کو اپنی نبی تک پہنچائے اگر وہ موجود ہے اور اگر نبی کا دور ختم ہے تو اپنے اوپر تک پہنچائے۔ یہ رویہ درست نہ ہوگا کہ وہ یہ خبر صرف اپنے ساتھیوں کے اندر پھیلاتا پھرے یا ایسے لوگوں کے درمیان پھیلائے جن پر اسلامی جماعت کی ذمہ داری نہیں ہے اس لیے کہ اسلامی قیادت ہوتی ہی وہ ہے جو حقیقت کو سمجھ

سکے۔ اور کسی خبر کی نشر کرنے کے صحیح موقع کو بھی سمجھے۔ یہاں تک کہ اگر ثابت بھی ہو جائے تو بھی بعض اوقات کسی خبر کا نشر کرنا مناسب نہیں ہوتا اور اس کا نشر نہ کرنا ہی اچھا ہوتا ہے۔

یہ تھی قرآن کی تربیت' قرآن کریم مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کی پختگی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی قیادت کے ساتھ وفاداری بھی پیدا کر رہا تھا۔ قرآن نے صرف ایک آیت میں اسلامی فوجی نظام کے تمام اصول جمع کر دیئے بلکہ آیت کے بھی صرف ایک ٹکڑے میں۔ یہ آیت یہ سکھلاتی ہے کہ ایک فوجی مسلسل امن اور خطرے کی خبریں لیتا ہے اور اپنے افسران بالا تک پہنچاتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس ایک آیت کی ابتداء میں ایک ایسے فوجی کی تصویر کشی کی گئی ہے جو خبریں لیتا ہے' امن کی بھی اور خوف کی بھی' اور وہ اسے مسلسل شائع کر رہا ہے بغیر سنجیدگی کے اور بغیر کسی تحقیق کے اور بغیر اس کے کہ اپنی قیادت کے سامنے پیش کر کے ہدایات لے لے۔ آیت کے وسطی حصے میں ایک فوجی کو یہ ہدایت دی جاتی ہے اور آخری حصے میں فوجیوں کے دلی تعلق کو اللہ سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ اللہ کے فضل کا ذکر کیا جاتا ہے اور اسے آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کا شکر بجالائے۔ اسے شیطان کی اطاعت سے ڈرایا جاتا ہے' جو گھات میں بیٹھا ہوا ہے اور اگر اللہ کا فضل و کرم نہ ہو تو وہ فوراً دلوں کے اندر فساد پیدا کر دے۔

(آیت) " ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ لاتبعتم الشیطن الاقلیلا (۴ : ۸۳) (اگر تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے)

یہ ایک آیت ہے اور اس کے اندر علم و معرفت کی وافر مقدار ثبت کر دی گئی ہے۔ اس قضیہ کے تمام پہلوؤں کا ذکر کر دیا گیا' یہ آیت ضمیر کے خفیہ ترین گوشوں تک اتر گئی اور دلوں کے اندر ہدایت اور علم بھر دیا گیا۔ یہ اس لیے کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے ہے۔ اور اگر یہ اللہ کی جانب سے نہ ہوتی۔

(آیت) " لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا "۔ (یہ لوگ اس میں بہت کچھ خلاف بیانیاں پاتے)

جب بات یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو اسلامی صفوں کی کمزوریوں کی نشاندہی کر دی جاتی ہے' ایسی کمزوریاں جو اسلامی معاشرے کی زندگی پر اور عمل جہاد پر اثر انداز ہو سکتی ہیں یہ غلطیاں اور ان کی درستی کا کام اس سبق کے آغاز ہی سے چل رہا ہے۔ اب مسلمانوں کو جہاد و قتال پر ابھارا جاتا ہے جس کا ذکر اس سبق میں ہوتا رہا ہے۔ یہاں آکر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ذاتی طور پر قتال فی سبیل اللہ کا مکلّف بنایا جاتا ہے۔ اب اس ذاتی ذمہ داری کے بعد کوئی شخص اس سے پیچھے نہیں رہ سکتا۔ نہ اسلامی جماعت میں پائے جانے والے کسی خلل اور نقص کی وجہ سے نہ راستے کی مشکلات کی وجہ سے۔ اس لیے کہ خطاب صرف ذات رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہے کہ آپ اٹھیں اور لڑیں اگرچہ اکیلے ہوں اس

لیے کہ جہاد ہر شخص پر ذاتی طور پر فرض ہے۔آپ بھی اپنی ذات کے ذمہ دار ہیں' ہاں اپنی ذات کے ساتھ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اہل ایمان کو بھی قتال پر ابھاریں۔اللہ تعالیٰ یہاں اہل ایمان اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فتح و نصرت کی امید دلاتے ہیں اس لیے کہ یہ معرکہ خود اللہ کا معرکہ ہے اور اللہ تعالیٰ بہت ہی زبردست ہے۔

84: فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ○

اس آیت اور اس سے ماقبل کی آیت کے اندر ہمیں اس وقت کی موجودہ جماعت مسلمہ کے خدوخال اچھی طرح نظر آتے ہیں جس طرح ہر دور میں پائے جانے والے انسانی نفوس کے خدوخال نظر آتے ہیں۔

اس کی ' (الف) ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت اسلامی صفوں کے اندر سخت بے چینی پائی جاتی تھی اور مکمل اتحاد نہ تھا جنگ سے پہلو تہی راہ میں رکاوٹیں اور جنگ سے پیچھے رہنے کی کمزوریاں ابھی تک اسلامی صفوں میں موجود تھیں۔ یہاں تک کہ لوگوں کو جہاد پر ابھارنے اور جوش دلانے کی خاطر یہاں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات مبارک کو حکم دیا گیا کہ آپ جہاد کریں اگرچہ آپ اکیلے ہوں۔آپ خود اپنے نفس کے ذمہ دار ہیں۔ہاں اس کے ساتھ ساتھ آپ مسلمانوں کو بھی ابھاریں لیکن آپ کی ذات کی طرف سے جہاد میں شرکت اس پر موقوف نہیں ہے کہ دوسرے لوگ اس کام کے لیے اٹھتے ہیں یا نہیں۔اگرچہ عملاً یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پکار کو سب کے جس طرح اسلامی تصور حیات کا یہ 'سب رد کردیتے لیکن یہاں اس انداز میں کلام کرنے کا مقصد یہ تھا کہ فریضہ بنیادی طور پر آپ پر عائد ہوتا ہے ایک اساسی اصول ہے کہ ہر شخص اپنی ذات کا ذمہ دار ہے کسی ایک کی ذمہ داری کسی دوسرے پر نہ ہوگی۔ہاں دوسروں کو جنگ کے لیے ابھارنا اپنی جگہ پر ہے۔

(ب) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مشرکین کے ساتھ جنگ چھیڑنے میں لوگ کس قدر خطرات محسوس کرتے تھے اور اس راہ میں کس قدر مشکلات تھیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خود مسلمانوں کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ وہ کافروں کا زور توڑ دے گا اور اس طرح مسلمان خود اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحفظ کے زیر سایہ ہوں گے ساتھ ساتھ یہ یقین بھی دلایا جاتا ہے کہ اللہ زبردست قوت والا ہے اور جب وہ کسی کو سزا دیتا ہے تو اس کی سزا بہت ہی سخت ہوتی ہے۔ یہ الفاظ کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے گا اس بات کا مظہر ہیں کہ اس وقت اہل کفر زور آور تھے۔ '

ان کی قوت کی وجہ سے اسلامی صفوں میں خوف محسوس کیا جاتا تھا اور یہ حالات احد اور خندق کے درمیانی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ احد سے لے کر خندق تک کا دور وہ دور ہے جس میں مدینہ طیبہ کے اندر مسلمان نہایت ہی مشکلات اور خطرات سے دوچار تھے۔ ان کے اندر منافقین گھسے ان کے ارد گرد یہودی پھیلے ہوئے تھے اور ہر وقت مشرکین کو فساد پر آمادہ کرتے رہتے تھے۔ اور اسلامی صفوں کے اندر اسلامی تصور ' ہوئے تھے حیات ابھی تک جاگزیں اور واضح نہ تھا۔

(ج) اس سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب انسان کو مشکلات میں قدم رکھنا ہوتا ہے تو اس کا سہارا صرف ذات باری ہوتی ہے اور اللہ کا سایہ عاطفت ہی باعث اطمینان ہوتا ہے۔ اس وقت صرف اللہ کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور اللہ ہی پر بھروسہ کام دیتا ہے۔ جب خطرات اپنی آخری انتہاؤں کو چھوتے ہیں اور تمام وسائل کام نہیں کرتے تو پھر ذات باری ہی کام دیتی ہے اور یہ تمام حقائق ایسے ہیں جن کو اسلامی نظام پیش نظر رکھتا ہے۔ اس لیے کہ نفس انسانی کا خالق اللہ ہے اور اللہ اپنے پیدا کردہ نفس انسانی کو اچھی طرح جانتا ہے کہ سک طرح اس کی تربیت کی جائے گی اور کس طرح اسے بچایا جائے گا اور کس طرح اسے جوش دلایا جائے گا اور کس طرح وہ مشکلات کو انگیز کرنے کے لیے تیار ہوگا۔

اس سبق کے آخر میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ اہل ایمان کو جنگ پر ابھاریں جنگ سے پہلو تہی کرنے والوں اور پیچھے رہنے والوں کا ذکر بھی ہوا تھا۔ اب یہاں ایک عام اصول بتا دیا جاتا ہے کہ ہر شخص نیکی اور بھلائی کے کام کے لیے سفارش کرے اور لوگوں نصیحت کرے اور بھلائی پر تعاون کی تلقین کرے۔ 'کو نصیحت کرے لوگوں کو بھلائی کی ہدایات دے

85: مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ○

اسے اس دعوت اور اس کے نتیجے 'اس مقصد کے لیے حوصلہ افزائی کرتا ہے اور دعوت جہاد دیتا ہے 'اب جو شخص لوگوں کو قتال پر ابھارتا ہے میں ہونے والے کام کا پورا پورا اجر ملے گا۔ اور جو شخص پہلو تہی کرتا ہے اور پیچھے رہتا ہے اور اس کے اگر برے نتائج نکلتے ہیں تو یہ شخص بھی ذمہ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیچھے رہنے والا نتائج بد کا ذمہ دار ہوگا۔ "کف " دار ہے۔

اسی اصول کا اطلاق ہر اچھی سفارش پر ہوگا اور بری سفارش پر بھی یہی اصول منطبق ہوگا۔ اگرچہ یہ اصول خاص حالات کے اندر ذکر ہوا ہے لیکن یہ قرآن کریم کا انداز بیان ہے کہ وہ ایک مخصوص واقعہ کے ضمن میں ایک کلی قاعدہ بیان کر دیتا ہے اور اس جزئی واقعہ کو بھی اس قاعدہ کلیہ کے

ایک جزو کے طور پر پیش کرتا ہے اور پھر تمام امور کو ذات باری سے مربوط کر دیتا ہے جو ہر چیز کا نگہبان اور رازق ہے۔ جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور لفظ (مقیت) میں یہ مفاہیم داخل ہیں۔

۔ (۴ : ۸۵) (اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے) اچھے کاموں کی سفارش کے بعد یہ کہا جاتا ہے اگر "وکان اللہ علی کل شییء مقیتا " (آیت) کوئی تمہیں سلام کرے تو یا تو اس سلام جیسا جواب دو یا اس سے اچھا جواب دو۔ کسی بھی معاشرے میں سلام ایک ایسا فعل ہے جس سے زندگی کی گاڑی نہایت ہی سکون اور سہولت کے ساتھ چلتی ہے اگر آداب سلام کو اچھی طرح ملحوظ رکھا جائے، سلام اور اچھائی کی سفارش کے درمیان گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ اگر کسی معاشرے میں دو فرد ایک دوسرے کو سلام نہیں کرتے تو وہ ایک دوسرے کو مزید کیا ہدایت دیں گے۔

86: وَإِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ○

اسلام نے اپنا ایک خاص سلام اسلامی معاشرے کو دیا۔ جس سے ایک مسلمان اور مسلمان معاشرہ غیر مسلم اور غیر مسلم معاشروں سے ممتاز ہو گیا وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ممتاز صفات کا مالک بن جاتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے دوسرے ۔ یہ سلام کو بالکل منفرد اور متمیز بنا دیتا ہے نہ کان نمک میں نمک بن جاتا ہے۔ معاشروں میں مدغم اور گھل مل نہیں جاتا

اور جواب سلام یا تو ویسا ہو گا یا اس سے زیادہ ' السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ' اسلام نے تین الفاظ دیئے ہیں۔ السلام علیکم کا جواب یا تو وعلیکم السلام ہے یا اس سے بہتر وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ دوسرے لفظ پر وعلیکم السلام ' ہو گا ماسوائے تیسرے لفظ کے۔ مثلاً السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ہو گا۔ اور تیسرے کا جواب ویسا ہی ہو گا۔ اس لیے کہ اس میں الفاظ پورے استعمال ہو گئے۔ اس لیے تیسرے کا جواب ویسا ہی ہو گا ۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ایسی ہی روایت ہے۔

ان کی ' جو اسلامی معاشرے کا خاص رنگ ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والوں کے خاص خدوخال ہوں ' اس میں ایک تو وہ انفرادیت ہے جس طرح اسلام نے ایک مخصوص قانونی تنظیمی نظام دیا ہے۔ اس موضوع پر ہم تحویل قبلہ کے موقعے پر بات کر آئے ہیں ' خاص عادات ہوں اسی طرح اسے ایک مخصوص قبلہ بھی دیا ہے۔ (دیکھئے سورت بقرہ پارہ دوئم) کہ اسلام نے اس امت کو جس طرح ایک نظریہ حیات دیا ہے

اور سلام کا ' دوسری یہ کہ اسلام نے امت مسلمہ کے افراد کے اندر نہایت پختہ محبت اور بھائی چارہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً سلام کا عام کرنا جواب سلام سے زیادہ اچھا ہو اور دوسرے تعلقات جن کی وجہ سے اسلامی سوسائٹی کے اندر نہایت ہی پختہ روابط اخوت و مودت پیدا ہوئے۔

یہ کہ تم کھانا کھلاؤاور "حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا گیا کہ کونسا عمل اچھا ہے؟ تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جواب دیا رہاسلام کا جواب تو 'اور یہ سنت ہے 'یہ تو حکم ہے کہ جماعت مسلمہ کے اندر سلام کرو "اسے سلام کرو۔ 'چاہے جاننے والا ہو یا نہ جاننے والا ہو وہ اس آیت کی رو سے فرض ہے۔ اسلامی معاشرے میں سلام کرنے کی عادت کے اثرات کا اندازہ عملاً اس وقت ہوتا ہے جب سلام کے ذریعے غیر متعارف لوگ باہم متعارف ہو کر ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور جو لوگ ایک دوسرے کو علیک سلیک کرتے رہتے ہیں ان کے باہم روابط قائم ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جو ہر اس شخص پر ظاہر ہو جاتی ہے جو اس عادت کے آثار کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کے نتائج پر غور کرتا ہے۔

تیسرے یہ کہ آیات قتال کے درمیان میں باہم دوستانہ تعلقات کے لیے یہ آیت باد نسیم ہے اور اس میں اسلام کے اصل الاصول کی طرف اشارہ اس لیے کہ اسلام دین امن ہے۔ اسلام کی جنگ بھی دراصل امن 'کر دیا گیا کہ اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ ملک کے اندر امن وامان قائم ہو کے لیے ہے یعنی کرہ ارض پر امن قائم کرنا اور یہ امن وسیع معنوں میں مطلوب ہے۔ ایسا امن جو اسلامی نظام حیات پر مبنی ہو۔

درس نمبر ۳۷ ایک نظر میں:

اس سبق میں اسلامی تصور حیات کے ایک نبی ادی اصول کا تذکرہ کیا گیا ہے یعنی عقیدہ توحید اور اللہ تعالیٰ کو اس کی حاکمیت میں وحدہ لاشریک سمجھنا ۔ پھر اس اصول کے مطابق اسلامی سوسائٹی اور اسلامی معاشرے کے تعلقات دوسرے کیمپوں کے ساتھ متعین کئے گئے ہیں لیکن دوسرے معاشروں کے ساتھ اسلامی معاشرے کے تعلق کی نوعیت کے تعین سے بھی پہلے اس سبق میں خود مسلمانوں پر سخت تنقید کی گئی ہے کہ وہ منافقین کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروہ منافقین مدینہ میں رہنے والے منافقین سے کوئی علیحدہ گروہ تھا ۔ یہ احکام اسلام کے اصل الاصول پر قائم ہیں اور یہ تنقید بھی اسی اصول کے مطابق ہے جس پر اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام قائم ہے۔ اس اصول کا ذکر ہر وقت ہوتا رہتا ہے جب بھی اسلامی نظام کوئی ہدایت دیتا ہے یا کوئی قانون سازی کی جاتی ہے۔

یہ احکام مختلف کیمپوں کے بارے میں ہیں اور یہ احکام ان اصول و قوانین کا حصہ ہیں جسے انسانی تاریخ میں سب سے پہلے اسلام نے متعارف کرایا۔ ان قوانین کا تعلق قانون بین الاقوام سے ہے۔ اسلام نے سب سے پہلے بین الاقوامی معاملات میں تلوار کے فیصلے سے ہٹ کر کچھ قواعد بنائے قوت کی دلیل اور جنگل کے قانون پر مشتمل بین الاقوامی رولز میں اسلام نے سب سے پہلے مہذب ضابطے پیش کئے۔

یورپ کے اندر قانون بین الاقوام کا آغاز صرف سترہویں صدی عیسوی (مطابق گیارھویں صدی ہجری) میں ہوا لیکن یہ قانون ماسوائے کاغذ اور سیاہی کے اور کچھ حیثیت نہ رکھتا تھا اور جو بین الاقوامی ادارے تشکیل دیئے گئے تھے وہ محض بین الاقوامی استعماری قوتوں کے خفیہ مقاصد کو قانونی

مشکل دینے کے آلہ کار تھے۔ نیز یہ ادارے سرد جنگ کے لیے میدان کارزار تھے۔ ان کا یہ مقصد ہر گز نہ تھا کہ حق حقدار تک پہنچے۔ نہ یہ ادارے صحیح معنوں میں انصاف کرتے تھے۔ یہ ادارے وجود میں محض اس لیے لائے گئے تھے کہ اس دنیا میں بعض بڑے اور طاقت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ہم پلہ ممالک کے درمیان کچھ جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جونہی ان ممالک کے مابین طاقت کا توازن ختم ہوا تو نہ ان بین الاقوامی قوانین کی کوئی حیثیت رہی اور نہ ہی ان بین الاقوامی اداروں کی کوئی قیمت رہی۔

جو انسانوں کے لیے رب ذوالجلال کا نظام زندگی ہے تو اس نے ساتویں صدی عیسوی میں بین الاقوامی معاملات کے اندر قانون سازی ' جب اسلام آیا کی یعنی پہلی صدی ہجری میں، یہ قانون اسلام نے از خود وضع کیا اور اس قانون کے بنانے کے لیے کی ہم پلہ حکومت کی طرف سے کوئی دباؤ نہ تھا۔ ' یہ قانون اسلام نے از خود بنایا اور از خود اس پر عمل کیا تاکہ اسلامی معاشرہ اس کی بنیاد پر دوسرے کیمپوں کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کرے انسانیت کے لیے انصاف کے جھنڈے بلند کرے اور اس کے لیے نشانات راہ متعین کرے۔ اگرچہ اس دور کے جاہلی دشمن کیمپ مسلمانوں کے ساتھ ان اسلامی بین الاقوامی قوانین کو سامنے رکھتے ہوئے معاملہ نہ کرتے تھے اس لیے کہ یہ اصول اور قوانین اسلام نے پہلی مرتبہ متعارف کرائے تھے۔ یہ بین القوامی قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کو یکجا کیا جائے تو بین الاقوامی قانون کا ایک مکمل ضابطہ سامنے آتا ہے۔ اس کے اندر ان تمام حالات کا حل موجود ہے جو کسی بھی وقت اسلامی مملکت اور دوسرے ممالک کو پیش آسکتے تھے۔ چاہے یہ ممالک پرامن معاہد کے حلیف یا مخالف اور غیر ' محارب کے حلیف ہوں ' غیر جانبدار ہوں ' مخالف ہوں ' پرامن ہوں ' برسر جنگ اور محارب ہوں جانبدار کے حلیف ہوں۔

یہاں ان اصولوں اور احکام کی تفصیلات کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس قسم کی تفصیلی بحث تو بین الاقوامی قوانین کے ماہرین کا کام ہے۔ البتہ ان آیات کے اندر جو اصول آئے ہیں ہم ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ اس سبق میں درج ذیل لوگوں کے ساتھ معاملہ کیا گیا ہے۔

(الف) وہ منافقین جو مدینہ میں مقیم نہ تھے۔

جس کے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی میثاق ہے۔ ' (ب) وہ لوگ جو ایسی قوم سے متعلق ہیں

(ج) وہ غیر جانبدار لوگ جو مسلمانوں کے ساہ ملکر لڑنا بھی پسند نہیں کرتے اور خود اپنی قوم کے ساتھ مل کر بھی لڑنا پسند نہیں کرتے لیکن وہ ہیں اپنے سابق دین پر۔

(د) وہ لوگ جو اسلامی نظریہ حیات کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ جب مدینہ آتے ہیں تو اپنے اسلام کا اظہار کرتے ہیں اور جب مکہ کو جاتے ہیں تو کفر کا اعلان کرتے ہیں۔

(ہ) مسلمانوں کے اندر قتل خطا اور مختلف لوگوں یعنی مختلف شہریت کے مالک لوگوں کے مابین قتل عمد کے واقعات میں ضابطہ۔ان تمام حالات میں ہمیں واضح احکام ملتے ہیں جو اپنے موضوع پر بالکل صریح ہیں۔اور تمام حالات پر ان کا انطباق ہوتا ہے۔اور یہ اصول بین الاقوامی معاملات کی ضابطہ بندی کا ایک حصہ ہیں اور ان کا حکم وہی ہے جو اس موضوع پر دوسرے احکام بین الاقوام کا ہے۔

87: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ○

درس نمبر ۷ ۳ تشریح آیات :

۸۷۔۔تا۔۔ ۹۴۔

اس سبق کا آغاز اس اصول سے ہوتا ہے جس کے اوپر اسلامی نظام کی عمارت استوار ہے اور اس کے تمام پہلو اس اصول سے ماخوذ ہیں۔

یا اسلامی ' اسلامی نظام زندگی کا پہلا قدم عقیدہ توحید ہے اور عقیدہ توحید کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ وحدہ حاکم ہے۔اس اسلامی قونون وضع کریں انتظامیہ قائم کریں۔ قانون نظام کا تعلق اسلامی معاشرے کے داخلی امور سے ہو یا بین الاقوامی قانون سے ہو جس کے مطابق اسلامی سوسائٹی دوسری سوسائٹیوں کے ساتھ برتاؤ کرتی ہے۔چنانچہ زیر بحث آیت بعض داخلی اور بین الاقوامی قوانین کا افتتاحیہ ہے۔

نفس انسانی کی تربیت کا سفر اس عقیدے سے شروع ہوتا ہے کہ تمام بندوں کو ایک دن اللہ میدان حشر میں اپنے سامنے کھڑا کرے گا اور اس دنیا میں اس نے انسانوں کو جو اختیارات دیئے تھے ان کے صحیح استعمال کے سلسلے میں بازپرس کرے گا۔ وہاں اس بات کی پرسش بھی ہوگی کہ اللہ کی ہدایات اور اس کے قوانین پر تم نے کس حد تک عمل کیا اور دنیا میں اپنی زندگی کے چھوٹے بڑے معاملات کے اندر کس حد تک تم نے اسلامی ضوابط کی پابندی کی کوین کہ تمہیں بہر حال وہاں اسی آزمائش اور امتحان کے لیے تو بھیجا گیا تھا۔آخرت میں صغیر وکبیر ہر معاملے کا حساب وکتاب ہوگا۔ حساب وکتاب اور جواب دہی کا یہی اخروی تصور ہے جو شریعت کے انتظامی اور قانونی ضابطوں پر عمل پیرا ہونے کا ضامن ہے اس لیے کہ ہر شخص کے ضمیر کے اندر ایک جیتا جاگتا چوکیدار بیٹھا ہوا ہوتا ہے اور اس وقت بھی نگران ونگہبان ہوتا ہے جب حکومت کے چوکیدار سو جاتے ہیں۔

اور یہ بات اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ومن اصدق من اللہ حدیثا (۴ : ۸۷) (اور اللہ سے زیادہ سچی کس کی بات ہے) اور یہ آپ کا وعدہ ہے جس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ " (آیت)

مسلمانوں کے دلوں کو یہ احساس دینے کے بعد اب اصل بات شروع ہوتی ہے۔ یہ احساس دلانا اسلامی منہاج تربیت کا ایک عام طریق کار ہے اور اس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کی پوری نظریاتی اور عملی عمارت اس عقیدے پر قائم ہے۔ غرض یہ احساس دلانے کے بعد اب اس بات پر تعجب کا اظہار کیا جارہا کہ مسلمان نفاق اور منافقین کے بارے میں یکسو نہیں ہیں اور ان کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز اختیار نہیں کرتے حالانکہ حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ فیصلہ کن اور دوٹوک بات کی جائیں۔ یک سوئیتو اور بات ہے مسلمان ان کے بارے میں واضح طور پر دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں اور ہر ایک کی اپنی رائے ہے۔ یہ اختلاف رائے مدینہ سے باہر بسنے والے بعض منافقین کے بارے میں پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی تفصیلات آگے آرہی ہیں۔ استفہام انکاری کا صیغہ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان معاملات کے بارے میں فکری ہم آہنگی کیوں نہیں ہے۔ اس سے اس بات کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ اسلام کی پالیسی یہ ہے کہ معاملات کے اندر فیصلہ کن اور دوٹوک موقف اختیار کیا جائے اور منافقین کے ساتھ تعلق اور ان کی نسبت نقطہ نظر رکھنے ہیں یک سوئیا اختیار کی جائے اور ان کے ظاہری امور کو دیکھ کر ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے بشر طیکہ کوئی منصوبہ طے شدہ ہو اور اس کے ساتھ نرمی کی ضرورت ہو۔

88-89: فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ○ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○

نمبر ۸۸ تا ۸۹۔ "(آیت)

یہ لوگ کون تھے ان کے بارے میں کئی روایات آتی ہیں جن میں سے دو روایتیں اہم ہیں۔

عبداللہ ابن زید (رض) کی سند سے زید ابن ثابت (رض) سے یہ روایت نقل کی ہے کہ 'عدی ابن ثابت 'شعبہ 'امام احمد (رح) نے بہز ان کے بارے میں حضور (صلی 'کچھ لوگ جو آپ کے ساتھ نکلے تھے وہ واپس ہوگئے 'رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) احد کی طرف نکلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھی دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ ان لوگوں کو قتل کر دیا جانا چاہیے اور ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ اس لیے کہ وہ مومن ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ 'قتل تو جائز نہیں ہے

یہ پاک ہے اور یہ ناپاک لوگوں کو اس "۔ (۴ : ۸۸) اس پر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "فما لکم فی المنفقین فئتین " (آیت) طرح نکال پھینکے گا جس طرح بھٹی لوہے کے میل کو نکال دیتی ہے۔ (صحیحین نے اسے شعبہ سے روایت کیا ہے)۔

عوفی نے حضرت ابن عباس (رض) سے نقل کیا ہے کہ یہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے اور مکہ میں مشرکین کی امداد بھی کرتے تھے۔ یہ لوگ مکہ سے اپنی کسی ضرورت کے لیے نکلے۔ وہ دل میں کہہ رہے تھے کہ اگر ہمیں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھی مل گئے تو ہمیں ان کا کوئی ڈر نہ ہو گا جب مسلمانوں کو اس بات کی اطلاع ہوئی کہ یہ لوگ سفر پر ہیں تو مسلمانوں کے ایک گروہ نے یہ کہا کہ نکلو اور ان بزدلوں کو قتل کر دو اس لیے کہ یہ لوگ ہمارے دشمن مشرکین کی امداد کرتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے ایک دوسرے گروہ نے کہا: سبحان اللہ (یا جس طرح انھوں نے کہا) کیا تم ایسے گروہ کو قتل کرتے ہو کہ انھوں نے وہ الفاظ ادا کئے جو تم نے ادا کئے ہیں؟ محض اس لئیجے کہ انھوں نے ہجرت نہیں کی اور اپنے وطن کو نہیں چھوڑا ہم ان کی جان ومال کو حلال کر لیں۔ اس طرح اس مسئلے پر مسلمانوں کے دو فریق بن گئے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) موجود تھے۔ آپ نے دونوں میں سے کسی کی رائے کی تردید نہ کی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (آیت) "فمالکم فی المنفقین فئتین" (۴ : ۸۸) (روایت ابن ابو حاتم) اب سلمہ، عکرمہ، مجاہد اور ضحاک (رض) اجمعین وغیرہ سے ایسی ہی روایات منقول ہیں۔

لیکن ہم دوسری روایت کے مضمون کو ترجیح دیتے ہیں اس لیے کہ یہ ایک، اگرچہ سند اور روایت کے اعتبار سے پہلی روایت زیادہ قوی ہے تاریخی حقیقت ہے کہ منافقین مدینہ کے خلاف کسی وقت بھی قتال کا حکم صادر نہیں ہوا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نہ ان کے ساتھ جنگ کی ہے اور نہ انھیں قتل فرمایا ہے۔ ان کے ساتھ معاملہ کرنے کا ایک دوسرا منصوبہ تھا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ ان کی سرگرمیوں سے چشم پوشی کی جائے اور خود مدینہ کی اسلامی سوسائٹی کو یہ موقعہ دیا جائے کہ وہ ان کو اگل کر رکھ دے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو کچھ کر رہے تھے وہ یہ تھا کہ مدینہ کے ارد گرد منافقین کے جو رابطے تھے انھیں کاٹ دیں۔ مثلا یہودی جو ان منافقین کو ورغلاتے تھے اور ان کے حامی تھے ان کو مدینہ اور پھر پورے جزیرۃ العرب سے جلاوطن کر دیا جائے۔ رہی آیت زیر بحث تو اس میں تو حکم دیا جارہا ہے کہ زیر بحث منافقین کو قید کیا جائے جہاں ملیں انھیں قتل کر دیا جائے لہٰذا یہ منافقین مدینہ کے اندر رہنے والے منافقین کے علاوہ کوئی اور گروہ ہو گا۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے، کہ ان کی پکڑ دھکڑ کا ہجرت تک موقوف ومشروط ہے کیونکہ آیت میں ہے۔

یہ تہدید ان لوگوں کے حق میں اس لیے آئی تاکہ وہ اس صورت حال سے نکل آئیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے حالات سے نکل آئے ہوں

(آیت) "فلا تتخذوا منھم اولیاء حتی یھاجروا فی سبیل اللہ فان تولوا فخذوھم واقتلوھم حیث وجدتموھم" (۴ : ۸۹) ۔

"لہٰذا تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ ہجرت سے منہ موڑیں تو ان کو پکڑو اور جہاں بھی ان کو پاؤ قتل کرو" ۔

اس ' یہ تہدید ان لوگوں کے حق میں اس لیے آئی تا کہ وہ اس صورت حال سے نکل آئیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے حالات سے نکل آئے ہوں لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے بارے میں یہ حکم نافذ نہیں فرمایا تھا لیکن (یھاجروا) کے لفظ سے یہ بات تو قطعاً ثابت ہو جاتی ہے کہ زیر بحث منافقین اہل مدینہ سے نہ تھے۔ مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ مدینہ کو ہجرت کر کے آجائیں۔ یہ واقعہ لازماً فتح مکہ سے پہلے کا ہو گا اور ہجرت تھی بھی فتح مکہ سے پہلے کیونکہ ہجرت کی تعریف یہ ہے کہ دار الکفر سے دار اسلام کی طرف ہجرت کی جائے۔ لوگ تحریک اسلامی سے آکر ملتے رہیں اور اسلامی نظام کے تحت آتے رہیں۔ ورنہ ان کی زندگی یا تو کفر گزرے گی یا نفاق میں۔ اسی سورت میں اس سبق کے بعد دوسرے سبق میں ایسے لوگوں پر سخت تقید وارد ہے جو ابھی تک مکہ کے دار الکفر میں مقیم تھے بغیر کسی عذر یا ضعف کے اور تھے مسلمان۔ اس وقت ان کے لیے مکہ دار الکفر اور دار الحرب تھا اگرچہ وہ ان کا اصلی وطن تھا اور وہ اس میں مقیم تھے۔ یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر ہم دوسری روایت کو ترجیح دیتے ہیں یا مکہ کے ارد گرد کسی آبادی میں تھا۔ یہ لوگ اپنے منہ سے تو اسلام کا اقرار کرتے تھے اور اپنے ' اور یہ کہ منافقین کا گروہ زیر بحث مکہ میں مقیم تھا عمل سے کافروں کی حمایت کرتے تھے۔ غرض آیت زیر بحث کو ایک بار پھر پڑھئے :

۔ (۸۸) ودوالو " فمالکم فی المنفقین فئتین واللہ ارکسھم بما کسبوا اترید ون ان تھدوا من اضل اللہ و من یضلل اللہ فلن تجد لہ سبیلا " (آیت) تکفرون کما کفروا فتکونون سوآء فلا تتخذوا منھم اولیاء حتی یھاجروا فی سبیل اللہ فان تولوا فخذوھم واقتلوھم حیث وجدتموھم ولا تتخذوا منھم ولیا ولا نصیرا ۔ (۸۹) (۴ : ۸۸۔۸۹)"

کیا تم ان لوگوں ' اور اللہ نے تو ان کو ان کے اعمال کے سبب الٹ دیا ہے ' پھر تم کو کیا ہوا کہ منافقوں کے بارے میں دو فریق ہو رہے ہیں " ۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی ' کو راہ پر لانا چاہتے ہو جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے اور جس کو اللہ نے گمراہ کیا تم اس کے لیے کوئی راہ نہ پاؤ گے لہٰذا تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ ' اس طرح تم سب برابر ہو جاؤ ' طرح کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے ہیں "جہاں بھی پاؤ اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ۔ ' مار ڈالو ' پھر اگر یہ اس شرط کو قبول نہ کریں تو ان کو پکڑو ' میں ہجرت کر لیں

ان آیات میں اس بات پر سخت نکیر ہے کہ منافقین کے بارے میں اختلاف رائے واقعہ کیوں ہوا اور ان کے بارے میں یہ حیرت انگیز موقف " ہر فریق نے کیوں اپنایا؟ اس لیے کہ اس موقف میں ایک فریق کی جانب سے بہت نرمی تھی اور اس بات کا اظہار ہو رہا تھا کہ ابھی مسلمانوں کا شعور اسلام کے بارے میں پختہ نہیں ہے۔ ان میں سے بعض لوگوں نے یہ کہا کہ تم ایسے لوگوں کو قتل کرتے ہو جنہوں نے وہی الفاظ ادا کئے ہیں جو تم نے ادا کئے ہیں اور محض اس لیے کہ انھوں نے اپنا وطن چھوڑ کر ہجرت نہیں کی؟ کیا یہی بات ان کی مال و جان کو مباح کرنے کے لیے کافی ہے؟ ان لوگوں کا تصور اسلام پختہ اس لیے نہ تھا کہ وہ صرف یہ بات پیش نظر رکھ رہے تھے کہ منافقین زیر بحث نے بھی اسی طرح کلمہ پڑھا ہے جس طرح ہم نے پڑھا ہے حالانکہ اس گروہ منافقین کے خلاف شواہد موجود تھے۔ ایک تو ان کا اپنا قول کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھی

دوسرے یہ کہ اہل ایمان کے ایک گروہ نے بھی ان کے بارے میں یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے دشمنوں کی ؛ہمیں کچھ بھی نہ کہیں گے امداد کرتے ہیں۔ان شواہد کے باوجود ان لوگوں کا موقف ان منافقین کے بارے میں کمزور موقف تھا حالانکہ انھیں فیصلہ کن اور دوٹوک موقف اختیار کرنا چاہیے تھا اس لیے کہ زبانی طور پر کلمہ شہادت پڑھنا اور عملا کفار کی امداد کرنا منافقت کی بین دلیل تھی۔ایسے لوگوں کے ساتھ کسی نرمی اور چشم پوشی کی ضرورت ہی نہ تھی۔یہ معمولی غلطی نہ تھی بلکہ اس سے تصور اسلام میں کمزوری کا اظہار ہو رہا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے اندر سخت تعجب کا اظہار کیا گیا اور سخت تنبیہ کی گئی۔

رہے مدینہ کے منافقین تو ان کے بارے میں مسلمان فکری طور پر بالکل یکسو تھے کہ یہ منافق ہیں۔لیکن ان کے ساتھ چشم پوشی اس لیے اختیار کی وہ یہ کہ ان کے ظاہری حالات پر ہی ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے اور ایک وقت ایک انھیں ؛گئی تھی کہ ایک خاص منصوبے کے تحت ایسا ہو رہا تھا مہلت دی جائے۔

لیکن یہ ایک دوسری صورت حال تھی کہ اہل اسلام میں سے ایک گروہ ان کی طرف سے اس لیے مدافعت کر رہا تھا کہ انھوں نی بھی وہی کلمہ پڑھا ہے جو ہم نے پڑھا ہے اور زبان سے انھوں نے بھی شہادت دی ہے کہ اللہ ایک ہے اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں حالانکہ یہ لوگ مسلمہ طور پر دشمنان اسلام کے امداد کندہ تھے۔مسلمانوں کی اس فکری کمزوری کی وجہ سے اور ان کے درمیان اختلاف رائے کی وجہ سے (جبکہ منافقین کا نفاق بالکل واضح تھا) اس آیت میں شدید تنبیہ کی گئی۔اور پھر تنبیہ کے بعد اس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی کہ۔(واللہ ارکسھم بما کسبوا) (اللہ نے ان کو ان کے اعمال کی وجہ سے الٹ دیا ہے) تم ان کے بارے میں جھگڑتے ہو اور اللہ نے ان کی بداعمالیوں اور ان کی بدنیتی کی وجہ سے انھیں ایسے حالات میں ڈال دیا ہے جن میں وہ الٹے نظر آ رہے ہیں۔اللہ کی جانب سے ان کے خلاف یہ گواہی ہے کہ وہ اپنی سوچ اور اپنے عمل کی وجہ سے ناقابل رشک صورت حال میں پڑے ہیں۔

اتریدون ان تھدوا من اضل اللہ) (کیا تم ان لوگوں کو راہ پر لانا چاہتے ہو جن کو اللہ نے "اس تنبیہ کے بعد ایک دوسری تنبیہ یہ کہ گئی۔(آیت گمراہ کر دیا ہے) یعنی مسلمانوں میں سے جو فریق ان کے ساتھ نرم رویہ اختیار کر رہا ہے اس کی منشا یہ تھی کہ انھیں راہ راست پر آ جانے کا موقعہ دیا جائے تاکہ یہ منافقانہ رویہ اختیار کرنا چھوڑ دیں۔اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے موقف کو نامناسب سمجھا اور منافقین کو ایسے حالات میں ان کے اعمال اور برے ارادوں کی وجہ سے ڈال دیا ہے لہٰذا ان کے ہدایت پانے کی امید فضول ہے۔

۔"جن کو اللہ نے گمراہ کیا تم اس کے لیے کوئی راہ نہ پاؤ گے "۔"ومن یضلل اللہ فلن تجد لہ سبیلا " (آیت)

اور اللہ لوگوں کو گمراہ اس لیے کر دیتا ہے کہ وہ اپنی نیت وارادے سے گمراہی کی راہ اپناتے ہیں۔ پھر وہ گمراہی کے لیے سعی کرتے ہیں اور اس راستے میں بہت ہی دور چلے جاتے ہیں۔ اتنے دور کہ ان کے لیے راہ ہدایت بند ہو جاتی ہے کیونکہ انھوں نے الٹ راہ اختیار کی ہوتی ہے اور ہدایت کے لیے اللہ کی امداد کے وہ طالب ہی نہیں رہے اور انھوں نے نشانات راہ کو گم کر دیا۔

اب ایک قدم آگے چلئے! ان منافقین کے اصل موقف کا اظہار یوں ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ خود گمراہ ہو گئے ہیں اور اپنی نیت اور عمل کی وجہ سے وہ اس پوزیشن کے مستحق ہو گئے ہیں جس میں وہ پڑے ہیں بلکہ وہ تو خود اہل اسلام کے بارے میں یہ خواہش رکھتے ہیں کہ وہ بھی کفر ہی کا راستہ اختیار کر لیتے تو اچھا ہوتا۔

۔ (وہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے ہیں۔ اس طرح تم " ودوالو تکفرون کما کفروا فتکونون سوآء " (آیت سب برابر ہو جاؤ) بیشک انھوں نے کفر کا راستہ اختیار کر لیا ہے اگرچہ انھوں نے بھی وہی کلمہ پڑھا ہے جو مسلمان پڑھتے ہیں اور انھوں نے دونوں باتوں کی شہادت دے دی ہے لیکن ان شہادت کو ان کا عمل جھٹلاتا ہے جس کے ذریعے یہ لوگ دشمنان اسلام کی امداد کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس حد پر بھی بس نہیں کرتے اس لیے کہ جو شخص کفر کو اپناتا ہے وہ کسی حد پر نہیں رکتا۔ وہ اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھتا جب تک اس پورے کرہ ارض پر سے اسلام اور مسلمان مٹ نہیں جاتے۔ اس مذموم مقصد کو لیے وہ سعی مسلسل میں مصروف رہتا ہے۔ وہ اس مقصد کے لیے جدوجہد کرتا سازشیں کرتا ہے تاکہ موجودہ اہل اسلام بھی لوٹ کر کافر ہو جائیں اور اس طرح تمام لوگ برابر ہو جائیں۔ ' ہے

زیر تبصرہ منافقین کے اس موقف کی یہ پہلی وضاحت ہے اور یہ وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ اس سے ان کے بارے میں اہل اسلام کی سوچ سے ہر قسم کی جھول دور ہو جاتی ہے۔ یہ سوچ ان کے قول وعمل کی واضح شہادت پر قائم ہو جاتی ہے اور اب یہ سوچ تضاد سے خالی ہوتی ہے۔ زبانی اظہار اسلام کی حقیقت کچھ نہیں رہتی جب تمام قرائن یہ بتاتے ہوں کہ ان لوگوں کا موقف منافقانہ ہے۔

قرآن کریم مسلمانوں کے شعور کو ایک چٹکی بھرتا ہے جس سے ان کے شعور میں ایک خوفناک احساس ابھرتا ہے اور یہ احساس قرآن کے ان الفاظ سے ابھرتا ہے۔

۔ (وہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے ہیں۔ اس طرح تم " ودوالو تکفرون کما کفروا فتکونون سوآء " (آیت
اور ابھی تک انھیں ' ۔ یہ خوف اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اہل اسلام نے حال ہی میں کفر کو ترک کر کے اسلام کا مزہ چکھا تھا ' سب برابر ہو جاؤ) ان کی عام سطح کس قدر بلند ہوئی اور ' اس بات کا شعور تھا کہ ان کی زندگی میں کس قدر عظیم تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ ان کا شعور کس قدر بلند ہوا ان کے شعور میں بھی تھا اور حقیقت واقعہ ' جاہلیت کے مقابلے میں ان کی سوسائٹی کو اسلام میں کس قدر سربلندی نصیب ہوئی۔ یہ فرق وامتیاز

اور یہ اشارہ ہی کافی تھا کہ وہ اس شخص کے دشمن بن جائیں جو انھیں دوبارہ ان سابقہ پستیوں کی طرف لے جانے کی تدابیر کر رہا تھا۔ 'میں بھی یعنی اس جاہلیت کی پستیوں کی طرف جس سے انھیں اسلام نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تھا۔ پھر انھیں ایک عام سطح پر ہی نہ چھوڑ دیا تھا بلکہ انھیں عمومی ترقی کے ذریعے بلند ترین چوٹی پر پہنچا دیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی نظام تربیت اس حقیقت کا سہارا لے کر خطرناک حالات کے مقابلے میں اور آگے بڑھنے کے حالات میں مسلمانوں کو دشمن سے اس طرح خبردار کر کے سخت تاکیدی احکام دیتا ہے۔

۔ (۸۹) (۴ :"فلا تتخذوا منھم اولیاء حتی یھاجروا فی سبیل اللہ فان تولوا فخذوھم واقتلوھم حیث وجدتموھم ولا تتخذوا منھم ولیا ولا نصیرا " (آیت ۸۹)

مار 'پھر اگر یہ اس شرط کو قبول نہ کریں تو ان کو پکڑو 'لہٰذا تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر لیں "" "جہاں بھی پاؤ اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ۔ 'ڈالو

تو اس سے محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے 'اللہ تعالیٰ نے یہاں جو یہ کہا کہ ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ اور مسلمانوں کے دلوں میں ان روابط کی وقعت تھی اور ہو سکتا ہے کہ یہ روابط ابھی تک 'قبائلی روابط اور تعلقات باقی تھے 'درمیان خاندانی بعض اقتصادی مفادات کی خاطر بھی ہوں۔ اسلام کا یہ طریقہ تربیت جاہلیت کے تمام رہے سہے آثار و روابط کو بھی پوری طرح جڑ سے اکھاڑ کر پھینک رہا تھا۔ اور جس طرح قرآن کریم تطہیر افکار کر رہا تھا اسی طرح امت مسلمہ کے لیے بین الاقوامی روابط کے اصول بھی طے کر رہا تھا۔

ایک ہی 'قرآن کریم امت کو بتا رہا تھا کہ کوئی امت کبھی بھی صرف خاندانی اور قبائلی روابط پر وجود میں نہیں آسکتی اور خون اور رشتے کے روابط تجارتی اور دوسرے اقتصادی مفادات کے روابط کی اساس پر کوئی امت وجود میں آسکتی ہے۔ امت ہمیشہ 'ملک اور علاقے میں رہائش کے روابط ایک مخصوص نظریہ حیات اور اس نظریہ حیات کی اساس پر اٹھنے والی سوسائٹی اور اجتماعی نظام کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دار اسلام کے باشندوں اور دار الحرب کے باشندوں کے درمیان دوستی اور ولایت کے تعلقات قائم نہیں رہ سکتے۔ اس وقت دار الحرب مکہ تھا جو مہاجرین کا وطن اصلی تھا اس لیے مکہ کے لوگوں حتیٰ کہ زبانی طور پر اسلام کا اقرار کرنے والوں اور مدینہ کے مسلمانوں کے درمیان بھی دوستی اس وقت تک نہ ہو سکتی تھی جب تک وہ ہجرت نہ کرتے جو صرف اللہ کے لیے اور اللہ کی راہ میں ہو اور اس کے علاوہ کسی یعنی صرف ایسے معاشرے کے قیام کے لیے ہو جو اسلامی نظام حیات کے مطابق زندگی گزار رہا ہو اور اس کے سوا 'دوسرے مقصد کے لیے نہ ہو

، کوئی خلط ملط نہ ہو ،جس میں کوئی ملاوٹ نہ ہو ، نہایت ہی فیصلہ کن اور نہایت ہی متعین مقصد کے ساتھ ، کوئی غرض نہ ہو۔ نہایت ہی پاک اسلامی نظام حیات کے سوا کوئی ہدف نہ ہو اور نہ کوئی اور مصلحت ہو۔

اپنے ملک اور مصلحتوں کو خیر باد کہہ دیں اور ، اپنے اہل و عیال کو چھوڑ دیں ، اگر یہ زبانی طور پر کلمہ اسلام پڑھنے والے پر شرط پوری کر دیں جس کے اندر اسلامی ، جو اسلامی نظریہ حیات پر مبنی ہے ، دارالاسلام کی طرف ہجرت کر آئیں تا کہ یہاں وہ اسلامی نظام کے تحت زندگی بسر کریں ہجرت ، شریعت جاری ہے تو پھر وہ اسلامی معاشرے کے ممبر بن جائیں گے۔ وہ امت مسلمہ کے ہم وطن ہوں گے۔ اگر وہ یہ شرط تسلیم نہ کریں کا انکار کر دیں تو پھر انھوں نے زبانی طور پر جو کلمہ پڑھا ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اگر وہ یہ شرط قبول نہ کریں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ (فخذوھم) انھیں پکڑ کر قید کر دو اور جہاں بھی تمہیں ملیں انھیں۔ (واقتلوھم) قتل کر دو اور ان میں سے کسی کو نہ دوست بناؤ اور نہ مددگار۔

اس لیے ، یہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ لوگ مدینہ کے منافقین نہ تھے ، اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بارے میں یہ دو احکام جو دیئے ہیں کہ مدینہ کے منافقین کے ساتھ اسلامی انقلاب نے بالکل مختلف پالیسی اختیار کی تھی۔

اسلام کی یہ پالیسی ہے کہ وہ اسلام کے مخالف عقائد رکھنے والے لوگوں کے ساتھ نہایت ہی فیاضانہ پالیسی اختیار کرتا ہے۔ اسلام مخالف اسلام لوگوں کو ہرگز اس امر پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ اسلامی نظریہ حیات کو قبول کر لیں بلکہ اسلام مخالف اسلام مذاہب کے پیروکاروں کو یہ اجازت بھی اسلام کے بارے میں اپنے مخالفانہ نظریات کا بھی اظہار کریں اور خود دارالاسلام میں ایسا کریں۔ ہاں ان کو ، دیتا ہے کہ وہ اپنے عقائد کا اظہار کریں یہ اجازت نہ ہوگی کہ وہ مسلمانوں کے اندر اپنے نظریات پھیلائیں یا اسلام کو برا بھلا کہیں۔ اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ مسلمان اہل کتاب کو برا بھلا نہ کہیں۔ لہٰذا یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ اسلام خود دارالاسلام کے اندر موجود اقلیتوں کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ خود اسلام کے بارے میں لعن طعن کریں۔ اگرچہ ہمارے دور کے بعض لوگوں نے اس قدر توسع اور ڈھیل سے کام لیا ہے کہ وہ مخالف اسلام لوگوں کو دارالاسلام میں اسلام پر لعن طعن کرنے کی اجازت دینا چاہتے ہیں۔ بہر حال اسلام کی یہ بھی بڑی فیاضی ہے کہ وہ انھیں اسلامی نظریہ حیات قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا اور دارالاسلام میں ان کو جان و مال اور آبرو کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ انھیں اس بات کی بھی اجازت دیتا ہے کہ) کے علاوہ اپنے مخصوص معاملات میں اپنی شریعت کے مطابق فیصلے بھی کریں۔Civil code عمومی نظام (

لیکن اسلام یہ رعایت منافقین کو نہیں دیتا جو زبانی طور پر تو اظہار ، اسلام اپنے مخالفین کو کھلے بندوں اپنے نظریات پر قائم رہنے کی اجازت دیتا ہے اور ، اسلام کرتے ہیں لیکن ان کا عمل اسلام کے مخالف ہوتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی نرمی نہیں برتتا جو اللہ کی توحید کے قائل تو ہیں مثلاً عوام کو حق ، صفت حاکمیت میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتے ہیں ، لیکن ان کے بعد اللہ کی خاص صفت ، کلمہ شہادت پڑھتے ہیں

قانون سازی دیتے ہیں کیونکہ انھوں نے احبار و رہبان اور حضرت مسیح کو اللہ کے سوا رب بنایا ہے اس لیے نہیں کہ وہ ان لوگوں کی عبادت کرتے ہیں بلکہ اس لیے کہ انھوں نے ان کو حلال و حرام مقرر کرنے کے اختیارات دے رکھے ہیں اور یہ اہل کتاب اس معاملے میں ان کی مکمل اطاعت کرتے ہیں۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ' نیز اسلام منافقین کے اس گروہ کے ساتھ بھی رواداری نہیں برتتا جو یہ شہادت دیتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اللہ کے رسول ہیں اور اس کے بعد وہ دارالکفر اور دارالحرب میں مقیم ہیں اور مسلمانوں کے دشمنوں کی امداد بھی کرتے ہیں۔ یہ بات رواداری نہ ہوگی بلکہ یہ بدکرداری ہوگی۔ اسلامی نظریہ حیات راواداری کا نظریہ ہے لیکن وہ بدکرداری اور عدم حمیت کا نظریہ نہیں ہے۔ یہ ایک سنجیدہ تصور حیات اور ایک سنجیدہ نظام حیات ہے اور سنجیدگی اور حقیقت پسندی اور رواداری میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ البتہ حقیقت پسندی اور بدکرداری کے درمیان تضاد ضرور ہے۔ یہ نکتے پہلی تحریک اسلامی کے لیے بھی قابل توجہ اور قابل غور تھے اور آج بھی ان میں تحریک اسلامی کے لیے اہم پیغام ہے۔

90: اِلَّا الَّذِيۡنَ يَصِلُوۡنَ اِلٰى قَوۡمٍۢ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ اَوۡ جَآءُوۡكُمۡ حَصِرَتۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَنۡ يُّقَاتِلُوۡكُمۡ اَوۡ يُقَاتِلُوۡا قَوۡمَهُمۡ‌ؕ
وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمۡ عَلَيۡكُمۡ فَلَقٰتَلُوۡكُمۡ‌ۚ فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡكُمۡ فَلَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ وَاَلۡقَوۡا اِلَيۡكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمۡ عَلَيۡهِمۡ
سَبِيۡلًا ○

ایسے لوگوں کو قید کرنے اور انھیں قتل کرنے کے حکم میں ایک استثنائی صورت بھی ہے۔ اگر یہ منافقین جو دشمنان اسلام کی معاونت کرتے ہیں چاہے یہ عہد ' اگر کسی ایسی مملکت یا ایسی سرزمین کے اندر رہائش پذیر ہیں جن کا اسلامی تحریک یا اسلامی حکومت کے ساتھ عہد و پیمان ہو چکا ہے تو اس صورت میں ان کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن سے عہد طے پا چکا ہے۔ ' معاہدہ امن ہو یا معاہدہ تخالف ہو ۔ (البتہ وہ منافق اس سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جن کے ساتھ تمہارا "الا الذین یصلون الی قوم بینکم و بینھم میثاق " (آیت ' معاہدہ ہے) اس حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر امن کے مواقع ہوں اور کوئی معاہدہ امن اسلام کے اساسی نظریات کے ساتھ متعارض نہ ہو اس کی وجہ سے اسلام کو قبول کرنے کی آزادی اور اسلام کی تبلیغ کی آزادی سلب نہ ہو رہی ہو اور دعوت اسلامی کی راہ میں بذریعہ قوت رکاوٹیں اور اس کے ساتھ مسلمانوں کو امن نصیب ہو رہا ہو اور وہ فتنوں اور مشکلات سے بچ رہے ہوں اور دعوت اسلامی کو جمود ' کھڑی نہ کی جاتی ہوں کا خطرہ بھی نہ ہو تو ایسی صورتوں میں اسلام معاہدہ امن کر سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو دشمن بھی کسی ایسی قوم کے ساتھ مل جائے جس کے ساتھ معاہدہ امن ہے یا معاہدہ دوستی ہے تو ایسی صورت میں ان معاہدات کا اطلاق اس شخص پر بھی ہو گا ان کے ساتھ ویسا ہی معاملہ ہو گا اور وہ لوگ ویسے ہی امن میں رہیں گے۔ ایسے احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر امن اور سلامتی اور صلح کی روح نہایت ہی واضح ہے۔

اسی طرح قیدی بنائے جانے اور قتل کر دیئے جانے کے حکم سے وہ منافق لوگ بھی مستثنیٰ ہیں جن کا تعلق ایسے لوگوں ایسے قبائل اور ایسے گرہوں کے ساتھ ہے جو اسلامی مملکت کے بارے میں غیر جانبدار ہیں۔ وہ نہ مسلمانوں کا ساتھ دیتے ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے ساتھ محاربے کے وقت اپنی اقوام کی امداد کرتے ہیں یعنی یہ لوگ اپنی قوم کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑنا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ دونوں فریقوں کے ساتھ بھی نہیں ملتے۔ نہ ان کے ساتھ اور نہ ان کے ساتھ۔

۔ (اسی طرح وہ منافق بھی مستثنیٰ ہیں جو تمہارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے "اوجاء وکم حصرت صدورھم ان یقاتلوکم اویقاتلوا قومھم" (آیت) دل برداشتہ ہیں نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے)

'اس حکم سے بھی اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اسلام ہر صورت میں قتل ومقاتلے سے اجتناب چاہتا ہے بشرطیکہ دوسرے لوگ لڑنا نہ چاہیں دعوت اسلامی کے راستے میں روڑے نہ اٹکائیں اور تحریک اسلامی اور اس کے مخالفین کے درمیان غیر جانبدار ہو جائیں۔ ایسے لوگ جو نہ جزیرۃ العرب میں اس وقت موجود تھے بلکہ خود قریش 'مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑنا چاہتے تھے اور نہ ہی اپنی قوم کے ساتھ مل کر لڑنا چاہتے تھے جزیرۃ العرب میں اس وقت موجود تھے بلکہ خود قریش کے اندر بھی ' کے اندر بھی موجود تھے اور نہ ہی اپنی قوم کے ساتھ مل کر لڑنا چاہتے تھے موجود تھے۔ ایسے لوگوں پر اسلام نے یہ پابندی عائد نہیں کہ وہ اسلامی کیمپ کے ساتھ مل کر لڑیں یا مخالف کیمپ کے ساتھ مل کر لڑیں۔ اسلام کے لیے یہ بات بھی کافی تھی کہ وہ اسلام کے خلاف جنگ نہ کریں۔ (فتح مکہ کے بعد جب سورۃ توبہ نازل ہوئی تو عملی تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ مرکز اسلام جزیرۃ العرب میں اسلام کے مقابلے میں کسی دوسرے دین کا موجود رہنا درست نہیں ہے۔ اس لیے ان احکام کے اندر معمولی تبدیلی کی گئی تھی) نیز یہ توقع تھی کہ اگر مشکلات دور ہو جائیں تو یہ لوگ اسلامی کیمپ میں آ جائیں گے جیسا کہ بعد میں عملاً ایسا ہی ہوا۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھاتے ہیں کہ ان غیر جانبدار لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ تمہارے لیے بہت ہی مفید ہے۔ اگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تو وہ فرض کر لیں کہ اس سے بہتر دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسری صورت یہی ہو سکتی ہے کہ ہو مسلمانوں کے جو کسی صورت میں بھی مسلمانوں کے 'مسلمانوں کے خلاف عملاً جنگ شروع کر دیں 'ساتھ برسرپیکار دشمنوں کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے

تو ایسے لوگوں کو اللہ نے جو غیر جانبدار بنا دیا ہے تو یہ تمہارے مفاد میں ہے لہٰذا وہ جس حال میں ہیں انھیں ان کے حال پر ` لیے بہتر نہیں ہے
چھوڑنا ہی بہتر ہے۔

اوجآء وکم حصرت صدورھم ان یقاتلوکم اویقاتلوا قومھم ولوشآء اللہ لسلطھم علیکم فلقتلوکم ”الا الذین یصلون الی قوم بینکم وبینھم میثاق “ (آیت
۔(۹۰) ”فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا

اللہ چاہتا توان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے۔ لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف “
صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔

اس طرح قرآن مجید کا حکیمانہ منہاج تربیت پرجوش مسلمانوں کو بڑی حکمت سے ایسے منافقین کے بارے میں غیر جانبداری اختیار کرنے پر مائل کر دیتا ہے حالانکہ وہ اس موقف کو بسہولت قبول نہ کر سکتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھاتے ہیں کہ اس میں تمہاری بہتری ہے۔ یہ اللہ کا تم پر فضل ہے کہ کچھ لوگ تمہارے بارے میں غیر جانبدار ہو گئے ہیں۔ اگر وہ غیر جانبدار نہ ہوتے تو مسلمانوں پر عائد ہونے والی جنگی ذمہ داریوں میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بتاتے ہیں کہ اگر تمہیں کسی جانب سے کوئی خیر آتی ہے تو اس کو مسترد نہ کریں اور اگر کوئی شر تم سے پہلو تہی کر کے گزرتا ہے تو خواہ مخواہ اسے نہ چھیڑیں۔ ان لوگوں کی غیر جانبداری کا کوئی اثر تمہارے دین پر نہیں پڑا۔ تمہارے نظریہ حیات اور نہ ہی تم کوئی بھاری قیمت دے کر امن حاصل کرتے ہو۔ ` کے اندر اس کے ذریعے کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوتی

بیشک اللہ نے مسلمانوں کو بھاری قیمت ادا کر کے امن کے حصول سے منع فرمایا ہے اس لیے کہ مقاصد اسلام میں سے کوئی مقصد ترک کر کے امن خریدنے کی اجازت ہر گز نہیں ہے۔ اسلام جو امن چاہتا ہے وہ ایسا امن ہے جس سے دعوت اسلامی کے حقوق میں سے کوئی حق ضائع (مسلمانوں کے ذاتی اور شخصی حق نہیں) بلکہ مسلمانوں کے وہ حقوق جن کا تعلق ان ` نہ مسلمانوں کے حقوق میں سے کوئی حق ضائع ہو ` نہ ہو کے منہاج حیات سے ہے اور جس کی وجہ سے وہ مسلمان کہلاتے ہیں۔

جو دعوت و تبلیغ کی راہ میں حائل ہیں کیونکہ دعوت و تبلیغ کی راہ میں ` اسلام کا حق یہ ہے کہ اس کے راستے سے تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے اسلام اس کرہ ارض پر کسی بھی جگہ میں کوئی رکاوٹ برداشت نہیں کرتا۔ اسلام میں اس بات کا بھی قائل ہے کہ دنیا میں اسلام کی پشت پر ایسی چاہے وہ اس کے لیے جو صورت بھی ` سیاسی قوت موجود ہو جس سے وہ تمام قوتیں خائف ہوں جو دعوت اسلامی کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہیں یا جو اسلام کو قبول کرنے والوں کو کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچاتی ہیں۔ اگر ایسی باتیں نہ ہوں تو پھر امن و سلامتی اسلام کی متاع گم ` اختیار کریں گشتہ ہے۔ لیکن حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ فرمان بھی ہمارے پیش نظر رہے کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔

اب ایک دوسرا گروہ سامنے آتا ہے اور اس کے ساتھ اسلام اس قسم کی رواداری کا رویہ اختیار نہیں کرتا جو مکمل طور پر غیر جانبدار لوگوں کے ساتھ اختیار کرتا ہے اس لیے کہ یہ اصل منافقین کا گروہ ہے اور نفاق کے ساتھ ساتھ شریر بھی ہے۔ اور یہ فریق نہ کسی ایسی قوم سے ملا ہوا ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کا عہد ہے اور نہ کسی حلیف قبیلے کے ساتھ ملحق ہے اس گروہ کے بارے میں اسلامی مملکت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو اصل منافقین کے ساتھ ہوگا۔

91: سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ۭ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْھُمْ وَاقْتُلُوْھُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ۧ

ابن جریر نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ یہ آیت اہل مکہ میں سے ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے 'یہ لوگ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آتے تھے اور ریاکاری کے طور پر مسلمان ہو جاتے تھے اور پھر قریش کے پاس واپس ہوتے تو الٹے پاؤں پھر کر دوبارہ بتوں کی پوجا شروع کر دیتے تھے۔ ان کا مقصد اس پالیسی کے اختیار کرنے سے یہ تھا کہ ادھر بھی امن سے رہیں اور ادھر بھی امن سے رہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بارے میں یہ حکم دیا کہ اگر وہ اپنی یہ پالیسی چھوڑ کر اصلاح پذیر نہیں ہوتے تو انھیں قتل کر دیا جائے۔ اس طرح اللہ کا یہ فرمان کہ اگر وہ تمہارے مقابلے سے باز نہ آئیں اور تمہارے سامنے مکمل صلح وسلامتی پیش نہ کریں اور تمہارے ساتھ جنگ سے ہاتھ نہ روکیں تو تمہیں اس لیے کہ ان پر حجت تمام ہو گئی ہے۔ 'اور جہاں بھی تمہیں ملیں وہاں پر انھیں قتل کر دو' اختیار ہے کہ تم انھیں پکڑ کر قید کر دو

جبکہ اس سے قبل کی دفعہ میں رواداری اور چشم پوشی سے کام لینے کی تلقین کی گئی تھی۔ ہر 'یہ اسلام کا ایک حقیقت پسندانہ اور دوٹوک پہلو ہے پالیسی اپنی جگہ پر مناسب اور ضروری تھی۔ واقعات اور حالات کے تقاضوں کے مطابق مختلف موقف اور پالیسیاں اختیار کی گئیں۔

اس انداز میں اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کے ان دو صفحات کے مطالعے سے ایک مسلم کے شعور میں بہت ہی اچھی طرح توازن پیدا ہوتا ہے۔ نیز اس سے اسلامی نظام زندگی کے اندر بھی توازن پیدا ہوتا ہے اور یہ توازن اور ہم آہنگی اسلامی نظام زندگی کی اساسی اور امتیازی صفت ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں ایک طرف سخت متشدد اور پرجوش لوگ ہیں جو ہر وقت مرو اور مارو کے لیے تیار رہتے ہیں حالانکہ یہ اسلام کی پالیسی نہیں ہے۔ دوسری جانب نہایت ہی کمزور کردار کے پگھلنے والے لوگ ہیں جو سرے سے اسلام میں جہاد ہی کے قائل نہیں۔ یہ لوگ اسلام کے بارے میں اس انداز سے بات کرتے ہیں گویا اسلام ایک ملزم ہے جو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہے اور یہ لوگ اس خطرناک ملزم کا مقدمہ لڑ امن چشم پوشی اور عفو و درگزر ہی پاتے ہیں اگر اسلام میں کوئی جنگ ہوئی ہے تو یہ لوگ ثابت 'رہے ہیں۔ یہ لوگ اسلام میں صرف رواداری

کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ جنگ اسلامی حکومت اور اسلامی تحریک کے لیے ایک دفاعی جنگ ہوئی ہے تو یہ لوگ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ جنگ اسلامی حکومت اور اسلامی تحریک کے لیے ایک دفاعی جنگ تھی اور یہ اس مقصد کے لیے نہ تھی کہ دعوت اسلامی کی راہ سے رکاوٹیں دور ہوں اور اس کی تبلیغ دنیا کے چپے چپے پر بلا روک ٹوک کی جاسکے۔

جنہوں نے اسلامی نظریہ 'ان لوگوں کے نزدیک یہ مقصد بھی نہ تھا کہ اس کرہ ارض کے کونے کونے پر وہ تمام لوگ پرامن زندگی بسر کریں حیات کو قبول کرلیا ہے۔ نیز ان لوگوں کے نزدیک اس پالیسی کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ دنیا کے اندر ایک ایسا نظام مملکت ہو اور ایک ایسا حالانکہ ایسے 'جو عقیدہ چاہیں اختیار کرسکیں 'قانونی اور دستوری نظام ہو جس کے تحت لوگ مکمل نظریاتی آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں لوگوں کی سوچ ہرگز اسلامی سوچ نہیں ہے اور نہ یہ اسلام کی حقیقی پالیسی ہے اسلام نے جو درج بالا بین الاقوامی اصول دیئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی حقیقی پالیسی کیا ہے ؟

تو 'یہ تو تھے مسلمانوں کے تعلقات دوسرے بیان الاقوامی ممالک اور کیمپوں کے ساتھ۔ رہے مسلمانوں کے باہم تعلقات امت مسلمہ کے اندر اگرچہ وہ بالکل مختلف ممالک کے باشندے ہوں اور اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ مسلمان مختلف ممالک میں رہتے تھے جس طرح آج وہ توان کے درمیان قتل ومقاتلہ قطعاً حرام ہے۔ کسی مسلمان کو صرف حد یا قصاص ہی میں قتل کیا جاسکتا ہے اس لیے 'مختلف ممالک میں رہتے ہیں دنیا میں ایسی کوئی چیز یا سبب نہیں ہے جو مسلمانوں کے عقیدے اور نظریے سے زیادہ اہم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مسلمان کو کسی صورت میں یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ دوسرے عقیدے اور نظریے سے زیادہ اہم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مسلمان کو کسی صورت میں یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ دوسرے مسلم کو ناحق کو قتل کرے اس لیے کہ ان کے درمیان نظریہ حیات اور عقیدے کے اتحاد کا زبردست تعلق پایا جاتا ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کسی مسلم کے ہاتھوں دوسرے مسلمان کا قتل خطا کے طور پر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں قتل خطا کے بارے میں قانون سازی کو ضروری سمجھا گیا۔ رہا قتل عمد تو اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلام مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کے ناحق قتل کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ یہ فعل حدود اسلام سے باہر کا فعل ہے۔